ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

زبان کی سیاست: اُردو ہندی تنازع کے تناظر میں

The Language Politics: In the context of the Urdu-Hindi Conflict

ڈاکٹر سامیہ احسن
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، منہاج یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر حمیرا عثمان
پرنسپل، گورنمنٹ کالج فار ویمن کلر کوٹ، بھکر

Abstract:

Language has always been of special importance in the world's politics. On one hand it represents the civilization and culture of a nation and on the other hand it determines its political and social status. For this reason, the Urdu-Hindi conflict arose in India. Although this conflict was initially started by the conspiratorial mind of the British under the policy of "divide and rule", but it later turned into a battle for survival .As per the principle of "survival of the fittest", it came to be understood that the one whose language prevails, will rule india. This thought eventually split Hindustan. Even today, the politics of language is spreading poison in the veins of the subcontinent and the subcontinent is going through a ruthless process of division after division. .

Key Words: Politics of Language , Urdu Hindi Conflict, Devide and Rule, survival of the fittest, devision of subcontinent.

ہندو مسلم تنازع کی تاریخ تیرہ سو سال پرانی ہے، یعنی جب سے مسلمانوں نے بطور حملہ آور برصغیر میں قدم رکھا۔لیکن اردو ہندی تنازع کی عمر دو سو سال سے زیادہ نہیں۔اس نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں جنم لیا، جب للو لال جی نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر اپنی کتاب "پریم ساگر" لکھی۔لیکن یہ کتاب اپنے نام کے برعکس محبت کا بہتا دریا کے بجائے نفرت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ثابت ہوئی اور اس نے ہندوئوں اور مسلمانوں کے درمیان زبان کے مسئلے پر نفرت کی وہ خلیج قائم کردی جسے دو صدیاں بھی پاٹ نہیں سکیں۔

انگریز جب برصغیر میں آئے تو یہاں مختلف علاقائی بولیاں بولی جاتی تھیں، لیکن ان کے درمیان ایک زبان ایسی تھی کہ جو ہندوستان کے ایک وسیع رقبے پر بلا امتیازِ قوم و مذہب سمجھی اور بولی جاتی تھی۔یہ زبان یہاں ہند کے تعلق سے ہندی کہلاتی تھی یا پھر اسے ریختہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔لیکن انگریزوں نے آکر اس کا ایک الگ نام ہندوستانی تجویز کیا اور اس ہندوستانی زبان کو انھوں نے مسلمانوں سے مخصوص کردیا۔ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کے بارے میں لکھا:

"میں نے ہندوستانی کی تفریق یہ کی کہ وہ ایسی زبان ہے جس میں ہندی، عربی اور فارسی کی آمیزش برابر تناسب سے ہو۔"(۱)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

یعنی جو بولی پہلے سے چلی آرہی تھی، اسے انگریزوں نے ہندوؤں کی بجائے مسلمانوں سے منسوب سمجھا اور ہندوؤں کے لیے ایک نئی زبان تشکیل کروائی۔گل کرسٹ کے اس بیان سے ہندوؤں کے اس دعوے کی قلعی بھی کھل جاتی ہے جو وہ ہندی کے اردو پر تقدم کے متعلق کرتے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے بولی جانے والی ہندی اب دراصل اردو ہے جس میں ہندی، فارسی اور عربی کے الفاظ خاص تناسب کے ساتھ آتے ہیں اور موجودہ ہندی کوئی اور زبان ہے، ایسی زبان جو ۱۸۰۳ء سے پہلے کہیں نظر نہیں آتی۔

زبان صر ف بولنے کا ایک آلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق زندگی کی ہر سطح سے ہے۔زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے طارق رحمٰن اپنی کتاب "Language and Politics in Pakistan" میں لکھتے ہیں:

...."the dominant language is used to produce knowledge, cultural artefacts and discourses, which are privileged in a certain social set up." (2)

زبان کی اہمیت کا احساس انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے دلوں میں پیدا کیا اور اس کے پیچھے ان کی وہی استعماری سوچ تھی جس کا پہلا نشانہ محکوم قوم کا اتحاد ہوتا ہے جو استعمار کے سر پر ہمیشہ تلوار کی طرح لٹکتا رہتا ہے، چنانچہ سب سے پہلے اسی کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یعنی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔انگریزوں کی تجربہ کار اور سازشی نظروں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ یہ دونوں قومیں گذشتہ کئی صدیوں سے مذہبی اور معاشرتی اختلافات کے باوجود ساتھ رہنے کی عادی ہوچکی ہیں۔ایک انگریز عالم جیمز فاربس نے اپنی کتاب ''مشرقی سوانح'' میں لکھا ہے :

''خواہ ہندو مسلمانوں میں کچھ عداوت پائی جاتی ہو، مگر یہ یقینی امر ہے کہ اب ان دونوں مذاہب کے پیرو، ایک دوسرے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔دو اس قدر مختلف مذہبی اصولوں کے ماننے والوں میں اتنی رواداری کی مثال یہاں کے سوا اور کہیں ملنا مشکل ہے۔''(۳)

ایسے حالات میں انگریزی حیلہ ساز ذہن نے ایک نیا مسئلہ اختراع کرنے کی ٹھانی جو ان دونوں قوموں میں کسی نئے تضاد کو سامنے لائے جسے انگریز ہوا دے سکیں، تاکہ اس کی زد میں آکر پرانے اختلافات بھی ناقابلِ برداشت محسوس ہونے لگیں۔لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر مقامی زبان کی ترویج اور اسے سیکھنے کے بہانے لسانی تفریق کی بنیاد رکھ دی گئی جس نے وقت کے ساتھ ساتھ ایک بڑے تنازعے کی شکل اختیار کرلی۔

لسانی تنازع کوئی سیدھا سادا مسئلہ نہ تھا، بلکہ یہ ایک ''ہشت پہلو'' مسئلہ تھا اور ان متنوع پہلوؤں کے باعث اس نے اردو ہندی تنازع سے بڑھ کر مسلم ہندو تنازع کی شکل اختیار کرلی جو بالآخر ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان اور بھارت کے قیام پر منتج ہوا۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

اس مسئلے کا تفصیل سے جائزہ لینے پر ہمیں درج ذیل پہلوؤں پر اختلافات کے واضح اثرات نظر آتے ہیں:

ا۔لسانی پہلو:

اس مسئلے کے لسانی پہلو کی دو سطحیں ہیں۔ایک سطح ذخیرۂ الفاظ کی ہے اور دوسری سطح رسم الخط کی۔ذخیرۂ الفاظ کی سطح پر ڈاکٹر گل کرسٹ نے للو لال جی کو ایسی تحریر لکھنے کو کہی تھی کہ جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ ہٹا کر سنسکرت کے الفاظ لگادیئے جائیں۔زبان کے صرفی و نحوی قواعد میں کوئی فرق نہ لایا گیا تھا۔محض الفاظ کا ردوبدل تھا۔لیکن للو لال کی اس تحریر نے ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقے کی توجہ اپنی طرف کرلی۔اور انھوں نے اس زبان کو اپنی پہچان کے طور پر قبول کرنا شروع کردیا۔ دیکھا جائے تو صرف الفاظ کی تبدیلی سے زبان کا لہجہ تو بدلا تھا لیکن اس کا جنم نیا نہیں ہوگیا تھا۔لیکن ہندوؤں نے لہجے کی تبدیلی کو نئے جنم کی صورت قرار دینا شروع کردیا اور انگریزوں نے اسے سرکاری قبولیت کی سند بھی عطا کردی۔گریرسن ہندی زبان کے ابتداء اور اس کی اصلیت کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''اس کی اصل عصرِ جدید سے تعلق رکھتی ہے جو گذشتہ صدی کے آغاز (انیسویں) میں انگریزوں کے زیرِ اثر متعارف ہوئی۔اس وقت تک جب کوئی ہندو نثر لکھتا تھا اور اردو استعمال نہیں کرتا تھا تو وہ اپنی مقامی بولی مثلاً اودھی، بندیلی اور برج بھاشا وغیرہ میں لکھتا تھا۔للو لال نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی تحریک پر مشہور کتاب ''پریم ساگر'' لکھ کر اس ساری صورتِ حال کو تبدیل کردیا۔اس کتاب میں جہاں تک نثری حصہ کا تعلق تھا وہ عملاً اردو میں لکھا گیا تھا۔اس میں جہاں کہیں (عام بول چال کے مطابق) فارسی الفاظ لکھے جانے چاہئیں تھے، وہاں (شعوری طور پر) ان کی جگہ ہندوی آریائی الفاظ استعمال کیے گئے۔اس عمل سے شمالی دوآبہ کی اصل بولی ازخود عود کرآئی۔اس انوکھے تجربہ کا انداز آغاز ہی سے کامیاب رہا۔پہلی کتاب کے موضوع نے جو اس زبان میں لکھی گئی، تمام اچھے ہندوؤں کی توجہ اپنی طرف مفعطف کرالی۔۔۔دوسری بات یہ کہ اس زبان نے ایک کمی کو پورا کردیا۔اس سے ہندوؤں کو رابطے کی ایک زبان (لنگوا فرینکا) مل گئی۔اس سے دور دراز کے مختلف صوبوں کے رہنے والوں کو مسلمانوں کے ناپاک (ان کے خیال میں) الفاظ کے بغیر آپس میں بات چیت کرنے کی ایک راہ مل گئی۔''(۴)

اصلاًیہ خیال ایک آئیڈیالوجی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا جسے انگریزوں نے اپنے مفادات کی خاطر رواج دے دیا تھا۔لیکن انگریزوں میں ایسے منصف مزاج مورخ بھی تھے جو اس حقیقت کا اظہار کرنے سے کتراتے نہ تھے۔ایسے ہی ایک مورخ R.W. Frazer لکھتے ہیں:

> ''جب (اردو کو) مسلمان لوگ ادبی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تو اس کی لفظیات کا بڑا حصہ فارسی یا عربی ہوتا تھا اور جب یہ ہندوستان کی مختلف بولیوں کے بولنے والوں کے لیے لنگوا فرانکا کی حیثیت سے استعمال ہوتی تو اس کی بیش تر لفظیات بازار میں بکار آنے والے الفاظ پر مشتمل ہوتی ..... ادبی ہندی تو محض ایک کتابی زبان ہے جو انگریزوں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

کے زیرِ اثر شکل پذیر ہوئی۔انھوں نے دیسی مصنفوں کو ترغیب دلائی کہ عام استعمال کے لیے ہندوستانی کے ایسے روپ میں کتابیں تصنیف کریں جس میں عربی فارسی کے تمام الفاظ نکال کر سنسکرت کے الفاظ ڈال دیئے گئے ہوں۔"(۵)

الفاظ کی تبدیلی نے اختلاف کی شکل اختیار کرلی جس کا احساس مسلمانوں ہی میں نہیں خود ہندوؤں میں بھی پایا جاتا تھا۔ جدید ہندوستانی مورخوں میں سے ڈاکٹر تارا چند نے اردو /ہندی معاملے کے پیچھے چھپی ہوئی سیاست کا تذکرہ کیا۔ریڈیو پر اپنی ایک تقریر میں تارا چند نے اس طرف صاف اشارہ کیا اور اپنی مختصر کتاب "The problem of Hindustan!" میں انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے کچھ پروفیسروں کے غلط رو جوش و خروش کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ جس کے نتیجے میں:

"ایک نئی طرح کی اردو (وجود میں آئی) جس میں اردو فارسی کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دیئے گئے تھے۔بادی النظر میں ایسا اس لیے کیا گیا کہ ہندوؤں کو ان کی اپنی ایک زبان مہیا کی جائے۔لیکن اس اقدام کے نتائج بہت دور تک گئے، اور ہندوستان آج بھی زبانوں کی اس مصنوعی تقسیم کے باعث دکھ اٹھا رہا ہے۔"(۶)

لسانی پہلو کی دوسری سطح رسم الخط کی تھی۔اردو زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔جب اس زبان میں فارسی و عربی الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ کی پیوند کاری کی گئی تو ساتھ ہی ہندوؤں نے یہ مطالبہ بھی کرنا شروع کردیا کہ اردو کے لیے بھی دیوناگری رسم الخط اختیار کیا جائے۔انھوں نے حکومت پر ایک طرف تو اردو کی جگہ ہندی کے بطور سرکاری زبان رائج کیے جانے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا، دوسری طرف ناگری رسم الخط کے لیے اصرار کرنا شروع کردیا۔بابو شیو پرشاد نے شمال مغربی صوبے میں بہت سے رجعت پسند ہندوؤں کے دستخطوں سے انگریز حکومت کو ایک معروضہ پیش کیا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ تمام سرکاری کاروائیاں بجائے عربی رسم الخط کے، جس میں اردو لکھی جاتی ہے، دیوناگری رسم خط میں ہونی چاہئیں، جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے۔اس کے جواب میں "اخبار انجمن پنجاب" کے ۲۰ ستمبر ۱۸۷۲ء کے پرچے میں ایک مدلل مضمون شائع ہوا جس میں مقالہ نگار نے لکھا تھا کہ

"یہ دعویٰ بلند آہنگی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دیوناگری رسم الخط بہ نسبت اردو رسم الخط کے زیادہ واضح ہوتا ہے اور اس میں جعل سازی بہت دشوار ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اردو رسم الخط میں ہر طرح کی سہولت نہ ہوتی تو صدیوں سے اس کو استعمال نہیں کیا جاتا۔دراصل دیوناگری رسم الخط میں طوالت ہوتی ہے اور اس کی تحریر میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، جس تحریر کے لیے اردو میں ایک منٹ درکار ہوتا ہے اس تحریر کے لیے دیوناگری میں چھ منٹ صرف ہوتے ہیں۔اور جو لوگ جعل سازی کرتے ہیں، انھیں نہ اردو تحریر میں ایسا کرنے سے کوئی روک سکتا ہے اور نہ دیوناگری میں۔"(۷)

رسم الخط کے مسئلے پر اختلاف نے بہت شدت اختیار کی۔میاں بشیر احمد اس صورتِ حال کے متعلق لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

"آج کل سب سے دل خراش سوال رسم الخط کا درپیش ہے۔اردو والے اپنے خط کی خوبیاں بیان کرتے ہیں، ہندی والے اپنے خط کی۔اردو والے اپنی زودنویسی اور خوب صورتی پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو سارے مغربی ایشیا اور شمالی و وسطی افریقہ کا رسم الخط بھی یہی ہے کہ ہمارا خط آسان ہے، زیادہ علمی شان لیے ہوئے ہے، ہندی والے کہتے ہیں کہ ہمارا رسم الخط خالص ہندوستان کی چیز ہے۔ایک تیسرا گروہ اس لڑائی جھگڑے سے گھبرا کر یا اکتا کر لاطینی حروف کا شیدا ہوا رہا ہے۔"(۸)

۲۔تہذیبی و ثقافتی پہلو:

جس طرح ہر قوم کی ایک تہذیب اور ثقافت ہوتی ہے اسی طرح زبان کی بھی تہذیب و ثقافت ہوتی ہے۔زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ اور تحریر کا انداز، ہر چیز اس کی ثقافت اور مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔اردو کا مزاج بھی عربی اور فارسی سے قریب تھا اور ان زبانوں کے ادب کی جڑیں اسلامی ثقافت کی روح میں اتری ہوئی تھیں۔سینتی کمار چٹرجی نے اردو کے خلاف ہندوؤں کے ردِ عمل کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:

"اردو ادب کی اپنے ابتدائی دور کے پورے دائرے میں۔۔۔فضا اشتعال انگیز حد تک غیر ہندوستانی رہی ہے۔یہ فضا فارس کی ہے۔ابتدائی دور کے شعراء میں سے کسی نے بھی ہندوستان کے طبعی خدوخال کا ذکر تک نہیں کیا۔۔۔ ہندوستان کی ہر اس شے سے قصداً آنکھیں بند کرلی گئی تھیں جسے فارسی شاعری میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔"(۹)

چنانچہ ہندوستانی ماحول کو رد کردیے جانے پر ہندوؤں نے اردو کو رد کردیا اور للو لال کے تجربے کے بعد وہ زبان اختیار کی جو بقول چٹر جی "اردو کی سنسکرتائی اور ہندیائی ہوئی شکل تھی اور عزیز احمد کے مطابق یہ مسلمانوں کی بیرونِ ہندوستان سے شعور و وجدان کے لیے مواد حاصل کرنے کی خواہش اور چیلنج کا ہندوؤں کی طرف سے مبالغہ آمیز جواب تھا۔(۱۰) چٹرجی اس کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

"ایک ایسا ادب اور زبان جس کی بنیاد ایسے آدرش پر ہو جو ہندوستان ہی کی سرزمین پر ہندوستان اور ہندوستان کی ثقافت کی نفی پر مبنی ہو، ہندوستان کے سپوتوں کا اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہونا،جو اپنی ثقافت سے چمٹے ہوئے ہوں، لازمی اور لابدی تھا، اور یہ چیلنج انتہائی سنسکرت آمیز ہندی کی صورت میں رونما ہوا۔"(۱۱)

یہ تہذیبی خوف اور غصہ ہندوؤں ہی میں نہیں ابھرا تھا بلکہ مسلمان بھی اس کا شکار ہوئے تھے۔اردو کے خلاف تحریک کو انھوں نے اپنی تہذیب اور معاشرت کے خلاف تحریک جانا۔بقول فرمان فتح پوری:

"خصوصاً سر سید احمد خان کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اردو پر جو وار کیا جا رہا ہے وہ دراصل مسلم قومیت اور مسلم تہذیب پر وار ہے۔اگر اردو مٹ گئی تو پھر مسلمان بھی ایک منفرد قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں گے۔"(۱۲)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

صوبہ بہار میں ایک تعلیمی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے جلسے میں بنگال کے گورنر مسٹر جی کیمبل (G.Camble) نے اردو کے خلاف ایک انتہائی زہر آلود تقریر کی اور بعد ازاں اس کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے خارج کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب حکم نامہ جاری کیا جس کی تفصیلات مسلمانوں کے لیے بہت تکلیف دہ تھیں۔مولوی عبدالحق کا خیال تھا کہ کیمبل پہلے ہی مسلمانوں کے خلاف تھا، دوسرا اس وقت بہار میں متہم مدارس فیلن اور کلکٹر انتھونی میکڈانلڈ بھی اردو کے سخت مخالف تھے اور ان کے کان بھرنے پر ہی کیمبل نے یہ حکم نامہ جاری کیا۔یہ کھلم کھلا ہندی اور ہندوؤں کی طرف داری کر رہے تھے اور حاکم ہونے کے زعم میں مسلمانوں کی زبان و ثقافت پر ضربِ کاری لگا رہے تھے۔ہندو اس ''کارِ خیر'' میں ان کے شریک تھے۔میاں بشیر احمد مسلمانوں کے اس احساس کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لیکن اگر ہمارے ملکی بھائی ہمیں ہمارا مناسب حصہ دینے پر راضی نہ ہوں یا ان کی اکثریت ہماری تہذیب کی روایات کو محض اجنبی سمجھ کر ملک بدر کرنا چاہیں، تو بدقسمتی سے ہمیں اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم تصور کرنا پڑے گا؛ جس کا مذہب جدا، بعض روایات جدا اور زبان بھی ایک حد تک جدا ہوگی۔(۱۳)

۳۔مذہبی پہلو:

اردوہندی تنازع کا ایک پہلو مذہبی بھی تھا۔ابتدا میں ہندو بھی اردو زبان میں لکھتے اور شاعری کرتے تھے۔ہندو استادوں کے مسلمان شاگرد اور مسلمان استادوں کے ہندو شاگرد ہوتے تھے۔لیکن رفتہ رفتہ اس سلسلے میں بھی آپس میں بُعد نمایاں ہوتا گیا۔محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' لکھی اور کہا کہ یہ اردو شعراء کا تذکرہ ہے، لیکن اس میں انھوں نے صرف مسلمان شعرا کو جگہ دی اور ہندو شعراء کو بالعموم نظر انداز کیا، یاذکر کیا بھی تو سرسری سا۔اسی طرح حالی نے سید احمد کی ''فرہنگ آصفیہ'' کی پہلی جلد کی اشاعت سے پہلے جو تبصرہ کیا تھا اس میں اردو کا لغت لکھنے کے لیے دو شرطیں بتائی تھیں: ۱۔دلی کا ہو، ۲۔شریف مسلمان ہو۔گویا اردو اور مسلمانوں کا تعلق مضبوط کیا جا رہا تھا۔اگرچہ شبلی نے اس کے خلاف لکھا اور اردو رسائل نکالنے والے ہندوؤں کی کاوشوں کو بہت سراہا بھی، لیکن خود ہندوؤں کی طرف سے بھی اردو کے لیے رویہ انتہائی متعصبانہ ہوتا گیا اور ہندو ادیبوں نے اردو کی مخالفت شروع کردی۔یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے زبان کا بھی مذہب ہوتا ہے اور اردو کا مذہب اسلام ہے۔خود ہندو ہندی کو بھی اپنے مذہب سے وابستہ کرنے لگے تھے۔دیانا دیال مہارشی شیوبرت لال ورمن بیسویں صدی کے نصف اول کے سربرآوردہ ہندو سنت، گیانی اور مصلح تھے۔انھوں نے کئی سو کتابیں اردو میں تصنیف کیں، لیکن وہ بھی یہی کہتے تھے کہ سوائے ہندی کے، دنیا کی کوئی اور زبان ہماری مذہبی ضرورتوں کو رفع نہیں کرسکتی۔چنانچہ بیسویں صدی

کے شروع ہی میں یہ خیال راسخ ہوچکا تھا کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور یہ دونوں زبانیں دونوں گروہوں کا مذہبی تشخص بن چکی تھیں۔ہندی کے مبلغوں کے اس طرح کے نعرے سامنے آرہے تھے:

(i) " ہند، ہندو، ہندی__ یہ تین ہمارے لیے ایک ہیں"۔

(ii) "دراوڑ سینا، شیوسینا جیسی ایک ہندی سینا بناؤ تاکہ ہندی کے لیے لڑیں۔"

(iii) "اردو صرف مسلمانی زبان ہے، الگ بھاشا نہیں، اردو کی فارسی/عربی لپی (رسم خط) کو ہٹاؤ، اردو اپنا سچا روپ۔ہندی __ پراپت (حاصل) کرے گی۔"

بھیم سین شرما جو آریا سماج تحریک کے علم بردار تھے، اس انتہا کو پہنچے کہ ایک مضمون کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تمام عربی اور فارسی الفاظ کی اصل سنسکرت ہے۔عزیز احمد لکھتے ہیں:

> "متذکرہ بالا حالات میں اس کے برعکس سرسید احمد خان اردو زبان کے ضیاع کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اتنا ہی مضرت رساں سمجھتے تھے جتنا ان کے مذہب کا ضیاع۔"(۱۴)

گویا دونوں اطراف ایک ہی جیسے رویوں اور سوچ کا اظہار کر رہی تھیں۔

۴۔جذباتی پہلو:

متذکرہ بالارویے اردو ہندی تنازع کے جذباتی پہلو کی طرف بھی نشان دہی کرتے ہیں۔دونوں مذاہب کے لوگوں نے ان زبانوں کے ساتھ جذباتی وابستگی قائم کرلی تھی۔اس کی ایک جھلک ہمیں میاں بشیر احمد کے اس بیان میں نظر آتی ہے:

> " مشہور انگریزی جملہ ہے:
>
> What is the good if a man gain the whole world and loose his own soul.–
>
> (کیا فائدہ اگر انسان ساری دنیا کو بھی پالے اور اپنی روح کو کھو دے۔)
>
> یہی وجہ ہے کہ ہم اہلِ اردو کبھی اپنا رسمِ خط نہیں چھوڑ سکتے۔ہمارا رسمِ خط ہماری تہذیب کا علم بردار ہے۔اس کی ایک ایک نوک پلک میں ہمارے لیے تمدن کے ہزاروں اشارے موجود ہیں۔کوئی پوچھے گا کیسے؟ ہماری صرف یہ گزارش کافی ہوگی کہ حضرت ہمارا دل یہی گواہی دیتا ہے، آپ ہمارا دل ہم سے چھینتے ہیں، یہ ہم دینے کو تیار نہیں۔"(۱۵)

ایسے ہی خیالات کا اظہار مولانا محمد علی جوہر کرچکے تھے کہ مسلمان اپنا رسمِ خط ترک نہیں کرسکتے کیونکہ یہ بقیہ مسلم دنیا سے تعلق قائم رکھنے کی ایک کڑی ہے۔ان کے خیال میں مسلمانوں کا فارسی کی جگہ اردو کا استعمال ہی ہندوستانی وطن پرستی کے لیے بہت بڑی رعایت ہے، مزید کوئی رعایت ممکن نہیں۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

کچھ ایسی ہی جذباتیت کا مظاہرہ ہندی کے لیے ہندوؤں کی جانب سے کیا جا رہا تھا اور وہ اپنے رسم خط کی حمایت میں جذباتی دلیلیں دے رہے تھے اور اس سلسلے میں اتنے شدت پسند ہوتے جا رہے تھے کہ مسلمانوں کو ہندی کے متوازی اپنی زبان قائم رکھنے کا حق بھی دینے کو تیار نہ تھے۔ حتیٰ کہ گاندھی جی بھی اس بات کے زبردست حامی تھے کہ ہندو مسلمان دونوں دیوناگری رسمِ خط میں ہندی لکھا کریں، کیونکہ ان کے خیال میں یہ رسمِ خط سنسکرت سے نکلی ہوئی مختلف صوبائی زبانوں کے رسم الخط کے قریب تھا۔ وہ تو یہاں تک بھی تیار نہیں تھے کہ ہندی کے لیے انگریزکے دیے گئے ہندوی لفظ ''ہندوستانی'' ہی کو اختیار کرلیا جائے۔وہ لاطینی رسم الخط کے استعمال کے بھی مخالف تھے جو منفی طور پر ہندی اور اردو کو باہم مربوط و متحد کرسکتا تھا۔چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس کی مختلف صوبوں میں وزارتیں قائم ہوئیں تو مہاسبھا نے یہ عہد کیا کہ وہ ہندوستان کی مقدس زبان سنسکرت کو استعمال کرے گی اور قومی و سرکاری زبان ''سنسکرت نستھا ہندی'' ہوگی۔

۵۔سماجی پہلو:۔

جس طرح ادب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''ادب خلا میں تخلیق نہیں ہوتا''،یہ سماج میں ہی پیدا ہوتا ہے اس لیے مختلف سماجی علوم سے رابطہ رکھتا ہے، اسی طرح زبان بھی خلا میں تخلیق نہیں ہوتی بلکہ گہرے سماجی روابط رکھتی ہے۔اس کے علاوہ زبان سماج کی تخلیق اور سماجی مرتبے کے حصول میں بھی بہت مددگار ہوتی ہے۔اردو ہندی زبانوں کے تصادم کا ایک پہلو سماج سے بھی مربوط تھا۔یہ دونوں اقوام انگریزی حکومت کے زیرِ سایہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھیں۔" Survival of the fittest" کے اصول کے تحت دونوں اس خیال میں تھیں کہ جس کی زبان حاوی ہوگی وہی قوم سماجی مراتب حاصل کرپائے گی۔زبان کا اثر تعلیمی نظام پر پڑنا بھی لازمی تھا۔مسلمانوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا کہ پہلے ہی فارسی کے متروک ہونے سے وہ تعلیمی استعداد میں بہت پیچھے رہ گئے تھے، اب اگر رسمِ خط بھی دیوناگری ہو جاتا تو ایک نئی مشکل کھڑی ہوجاتی۔''اخبار انجمنِ پنجاب'' میں اس کے خلاف چھپنے والے مضمون میں اس خدشے کا اظہار واضح الفاظ میں کیا گیا تھا:

> ''بہرحال اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر حکومت نے دیوناگری رسمِ خط کی حمایت کا تہیہ کرلیا تو مسلمانوں کو اس سے بڑا نقصان پہنچے گا، اور وہ جہالت کی دلدل میں پھنس جائیں گے۔''(۱۶)

رسمِ خط کے حوالے سے مزید نکات واضح کرتے ہوئے مضمون نگار مزید خدشات کا اظہار کرتا ہے:

> ''اگر اردو کی جگہ دیوناگری رسمِ خط حکومت نے اختیار کرلیا تو مسلمانوں کے لیے سرکاری دفاتر میں ملازمتیں باقی نہیں رہیں گی، ویسے بھی سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور جو مسلمان سرکاری ملازمت میں ہیں وہ ادنی خدمات پر فائز ہیں۔اگر دیوناگری کی تجویز منظور ہوگئی تو ان کی تعداد سرکاری دفاتر میں اتنی بھی باقی نہ رہے گی۔''(۱۷)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

۶۔اقتصادی پہلو:

زبان کی اہمیت جہاں سماجی مرتبے کے لیے مسلم ہے، وہیں اقتصادی خوش حالی کے لیے بھی ضروری ہے۔سرکاری ملازمتوں سے ہاتھ دھونے کا لامحالہ اثر مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر پڑنا تھا جو کہ ویسے ہی کچھ زیادہ خوش گوار نہیں تھی۔ہندو بھی جانتے تھے کہ دیوناگری رسم خط نہ صرف تعلیمی میدان میں انھیں مسلمانوں سے آگے نکلنے میں مدد دے گا بلکہ ملازمتوں کا حصول بھی ان کے لیے سہل بنائے گا۔دیوناگری رسم خط ایک مشکل رسمِ خط ہے جس کاسیکھنا مسلمانوں کے لیے آسان نہ تھا۔ ہندوؤں کے لیے وہ مذہبی رسم الخط ہونے کی وجہ سے آسان اور جانا پہچانا تھا۔ایسے میں ان کے لیے مسلمانوں سے آگے نکلنے کے مواقع زیادہ بہتر ہوسکتے تھے۔ہندوؤں کا یہ بھی خیال تھا کہ اس طرح تعلیمی اور اقتصادی کمزوری کے سبب وہ مسلمانوں کو آسانی سے اپنی راہ پر لگالیں گے۔صوبہ بہار اور بنگال میں اردو کے اخراج میں اپنی کامیابی سے وہ خاصے پرجوش ہوگئے تھے کیونکہ اس سے مسلمانوں کے مفادات پر ضرب پڑی تھی اور معاشی اور سماجی فوائد کے حصول سے متعلق ہندوؤں کے خیالات اور سوچ کے مطابق نتائج برآمد ہو رہے تھے۔اب وہ سارے ہندوستان میں یہی صورتِ حال چاہتے تھے اور مسلمان بھی بہار کے تجربے کے بعد سے زیادہ منظم اور متحد ہوکر کام کرنے کی سوچ رہے تھے کیونکہ معاشی مفاد پر چوٹ سب سے گہری ہوتی ہے اور اب وہ اس خطرے کو مکمل طور پر اپنے سر پر منڈلاتا محسوس کر رہے تھے۔

۷۔تاریخی پہلو:

اس مسئلے کا ایک پہلو زبان کی تاریخ سے متعلق تھا۔دونوں قومیں ایک ہی تاریخ اور ادبی روایت کی حامل ہونے کا دعویٰ کر رہی تھیں۔ہندی کے حامیوں کا یہ کہنا تھا کہ اردو کچھ بھی نہیں بلکہ وہ ہندی کی محض ایک شیلی یا شاخ ہے۔وہ اردو پر اپنا تفوق ثابت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اردو اپنے راستے سے ہٹ گئی ہے اور اسے واپس اپنی اصل یعنی دیوناگری رسم خط کی طرف واپس آجانا چاہیے۔اردو نے برصغیر میں جو تدریجی مراحل طے کیے، ہندی والے وہ سب ہندی کے کھاتے میں ڈالتے تھے اور اسے اردو کا سچا روپ قرار دیتے تھے۔ڈاکٹر سنتی چٹر جی کا بیان ہندوؤں کے اس دعوے کی قلعی کھولتا ہے:

> ''لسانی نقطۂ نظر سے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان، مغربی ہندی بولی یا دہلی کی کھڑی بولی 'ہندوستانی' کے دو روپ ہیں ،لیکن تاریخی اعتبار سے اردو اس چیز کی ترمیم شدہ ''مسلمانیائی ہوئی'' شکل نہیں جو آج ہندی (یعنی سنسکرت زدہ کھڑی بولی) کے نام سے معروف ہے، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہی ہے۔وہ فارسی آمیز ہندوستانی، جس نے اٹھارویں صدی میں مغل دربار کے حلقوں میں فروغ پایا، (اور جو اس سے پہلے دکن کے دکنی روزمرہ میں ملتی ہے) اسے ہندوؤں نے اپنایا۔۔(پھر) انھوں نے دیسی ناگری کو اپنایا اور بڑی گاڑھی سنسکرت آمیز

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

لفظیات کا استعمال شروع کردیا۔۔۔اور اس طرح انھوں نے آج کی ادبی ہندی کی تشکیل کی۔یہ کام ۱۸۰۰ء کے آس پاس ہوا اور خاص کر کلکتہ میں۔"(۱۸)

گویا اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو ہندی کی شاخ نہیں بلکہ "ہندی اور کچھ نہیں، صرف اردو کی ایک شیلی ہے"۔(۱۹)

چٹرجی کا یہ بیان غلط بھی نہیں ہے۔اگر عقلی استدلال کی رو سے دیکھیں تو ہندو ہندوستان میں بہت سی علاقائی بولیاں بول رہے تھے جو ایک ہی جڑ سے نکلی ہوئی مختلف شاخیں تھیں۔مذہبی زبان کے طور پر سنسکرت موجود تھی۔چنانچہ ان حالات میں ہندوؤں کو کسی مکمل نئی زبان کی ضرورت نہ تھی۔جب کہ مسلمان باہر سے آئے تھے اور ان کی مذہبی زبان عربی اور ثقافتی زبان فارسی تھی، اور یہ دونوں اہلِ ہند کے لیے مکمل طور پر اجنبی تھیں۔ہندوستان کے لوگوں سے بات چیت کے لیے اور اس ملک کے ماحول میں رچنے بسنے کے لیے انھیں ایک نئی زبان کی ضرورت تھی۔ایسی زبان کی جو کہ ان کی اپنی زبانوں سے بالکل مختلف نہ ہو لیکن ایسی بھی ہو کہ جو مقامی آبادی کے ساتھ ابلاغ کاکام دے سکے۔چنانچہ ان کا ایسی زبان اختراع کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔یوں بھی مثل مشہور ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"، چنانچہ کوئی بھی چیز، وہ بھی زبان جیسی گنجلک چیز ،بغیر وجہ کے تشکیل نہیں پاسکتی۔اور نئی زبان کی ضرورت مسلمانوں کو تھی ہندوؤں کو نہیں۔

۸۔سیاسی پہلو:

طارق رحمٰن لکھتے ہیں:

> "The use of language for the creation of identity -- specifically Hindi and Muslim identities in the nineteenth century -- is intimately related to politics.This phenomenon, called the Urdu-Hindi controversy, occured in British India into Bharat and Pakistan."(20)

زبان کی سیاست کے پیچھے بنیادی محرک طاقت کا حصول تھا۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ تنازع انگریز نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے شروع کیا تھا اور بہت عرصے تک وہ اسے اپنے اقتدار کے لیے استعمال کرتا رہا۔اس بات کا اعتراف اس دور میں یورپی مورخین بھی گاہے بہ گاہے کرتے رہے اور اب دورِ جدید کے ہندوستانی اور پاکستانی لسانی مورخین بھی بخوبی کررہے ہیں، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ عرصے کے بعد خود ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی مفادات اس تنازع سے مربوط ہوگئے اور اس سے اس جھگڑے میں ایک نیا جوش و خروش پیدا ہوگیا۔گادساں دتاسی نے لکھا تھا:

> "زبان کی چپقلش ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو مخالف اور متحارب گروہوں میں بانٹ رہی ہے اور کچھ ہندو تو اردو کی بجائے انگریزی کو بطور سرکاری زبان قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔"(۲۱)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

۱۹۳۰ء کے لگ بھگ مسلمانوں کو اس امر کا احساس بہت شدت سے ہوا کہ ہندوؤں کی زبان ہندی ہے تو ہندوؤں کے زیرِ تسلط ملک میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے، اور اردو چونکہ مسلمانوں کے تشخص کی علامت بن چکی ہے اس لیے مسلمان بھی اس خطے میں امن سے نہیں رہ پائیں گے۔سرسید احمد خان جیسے ہندومسلم اتحاد کے حامی انسان کو بھی ان حالات نے چونکا دیا اور ہندو اور مسلمانوں کو ایک دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہ دینے والا یہ لیڈر ہی سب سے پہلے ان کی علیحدگی کی پیش گوئی کرنے پر مجبور ہوگیا۔دراصل انگریز کے ساتھ آئے ہوئے جمہوری نظام کے مطابق ہندو یہ سمجھنے لگے تھے کہ اب اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حکومت ان کو مل جائے گی۔ایک طرف اس خیال نے ان میں جوش پیدا کردیا لیکن دوسری طرف ہزار سالہ غلامی نے ان میں بے صبرا پن بھی پیدا کردیا۔اب اچانک ان کے دلوں میں حکومت کی امنگ جاگی تو وہ اسے کسی بردبار قوم کی طرح ہضم نہ کرسکے۔انھوں نے جمہوری اصولوں کی روشنی میں ازخود مسلمانوں کو اپنا محکوم تصور کرنا شروع کردیا۔ان کی صدیوں پر محیط مساویانہ حکومت کے جواب میں ہندوؤں کے دل میں ان سے زندگی کا ہر حق چھین لینے کی خواہش جاگی۔زبان بھی اسی خواہش کے اظہار کا ایک ذریعہ بنی اور انھوں نے بزعمِ خود اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی برتری کے گن گانے شروع کردیے۔ہندو جتنا اپنے تعصب میں آگے بڑھتے گئے مسلمانوں میں اتنا ہی علیحدگی پسندی کا رجحان بڑھتا گیا۔انگریزوں کے بوئے ہوئے نفاق کے بیج کانٹوں بھری فصل لائے تو ہندو مسلم فسادات کی صورت اختیار کرگئے۔نسلی اور مذہبی بنیادوں پر لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگے۔ایسے میں کچھ راہنماؤں نے دیگر امور کے ساتھ زبان کے اشتراک سے اس نفاق کو اتحاد میں بدلنے کی کوشش کی۔پریم چند اپنے ایک مضمون ''اردو، ہندی، ہندوستانی'' میں بڑے پرجوش انداز میں لکھتے ہیں:

> ''اردو اور ہندی کی نوعیت جدا ہے۔یہاں تو دونوں ہی ہندوستان کی قومی زبان کہلانے کی مدعی ہیں مگر چوں کہ اپنی انفرادی صورت میں دونوں قومی ضرورتوں کی تکمیل نہ کرسکیں اس لیے اضطراری طور پر خود بخود ان کے اتصال کا عمل شروع ہوگیا اور وہ متحدہ صورت پیدا ہوگئی جیسے ہم ہندوستانی زبان کہنے میں حق بجانب ہیں۔۔۔جس طرح انگریزوں کی زبان انگریزی، جاپان کی جاپانی، چین کی چینی، اسی طرح ہندوستان کی قومی زبان کو اسی وزن پر ہندوستانی کہنا مناسب ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔۔۔بہرحال ہندوستان کی قومی زبان نہ اردو ہے نہ ہندی، بلکہ ہندوستانی ہے جو سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے اور بڑے حصے میں بولی جاتی ہے، لیکن لکھی کہیں نہیں جاتی، اور اگر کوئی لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اردو اور ہندی کے ادیب ٹاٹ باہر کردیتے ہیں۔''(۲۲)

اس زبان کو ہندوستانی قرار دے دینے کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے بھی لکھا۔لیکن دونوں اقوام کی جانب سے اس سلسلہ جنبانی کو کوئی پذیرائی نہیں ملی اور حالات بدستور خراب ہوتے چلے گئے۔انجام کار اس اختلاف کا نتیجہ برصغیر کی تقسیم کی شکل میں نکلا اور پاکستان اور بھارت دو ملک وجود میں آگئے۔اردو ہندی تنازعے کے آغاز میں سرسید نے ایک خط میں لکھا تھا:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

"مجھے ایک اور خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے۔بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبانِ اردو، خطِ فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے ،مٹا دیا جائے۔۔۔یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔۔۔اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ، مسلمان علیحدہ ہوجائیں گے۔یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندو سے علیحدہ ہوکر اپنا کاروبار کریں تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔اس میں صرف دو امر کا خیال ہے۔ایک خاص اپنی طبیعت کے سبب سے کہ میں کل اہلِ ہند، کیا ہندو، کیا مسلمان، سب کی بھلائی چاہتا ہوں۔دوسرے، بڑا خوف اس بات کا ہے کہ مسلمانوں پر نہایت بداقبالی اور ادبار چھایا ہے۔۔۔وہ ہرگز اس قابل نہیں ہونے کے جو اپنی بھلائی کے لیے کچھ کرسکیں۔"(۲۳)

سرسید کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ہندوؤں نے مخالفت نہ چھوڑی اور مسلمان الگ ہوگئے۔انھیں اپنا وطن مل گیا۔واقعی وہ ہندوؤں سے زیادہ فائدے میں رہے۔متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے وہ یہ سب نہ پاسکتے جو آج انھیں حاصل ہے۔لیکن افسوس کہ سرسید کی پیش گوئی کا دوسرا حصہ بھی پورا ہوا اور مسلمان اپنی کوتاہ اندیشی کے باعث اپنے وطن کا آدھا حصہ گنوا چکے ہیں اور جو باقی ہے اسے بھی سنبھالنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک چیز اور نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انگریزوں نے برصغیر میں لسانی تفریق کا جو بیج بویا تھا وہ تناور درخت بن چکا ہے۔اس کا تنا تو اردو ہندی تنازع ہے لیکن اس سے اب بہت سی لسانی تفریق کی شاخیں پھوٹ چکی ہیں۔اردو ہندی تنازع میں مذہب بھی ایک بنیادی اور اہم عنصر تھا لیکن موجودہ لسانی تنازعے صرف زبان کی بنیاد پر ہیں۔بنگلہ دیش بن چکا؛ سرائیکی تحریک، سندھو دیش، پختون خواہ کی تحریکیں چل چکیں؛ سری لنکا میں تامل تحریک نے زور پکڑا ہوا ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ اس خطے کی رگوں میں گھولے گئے اس زہر کا اثر کب تک قائم رہتا ہے اور کیا کیا شکلیں دکھاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: "اردو زبان کیا ہے" ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص: ۸۵

۲۔ رحمٰن، طارق، ڈاکٹر: "Language and politics in Pakistan" ، کراچی:آکسفورڈ، ص: ۲۳

۳۔ یوسف علی، عبداللہ: انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ"، کراچی: ص: ۵۷

۴۔ احمد، عزیز، ۱۹۶۴ء، "اسلامی کلچر" ترجمہ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، کراچی: ادارہ ثقافتِ اسلامی، ص: ۳۶۹۔۳۶۸

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

۵۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، ڈاکٹر: ''اردو کا ابتدائی زمانہ''، کراچی: آج کی کتابیں، ص: ۴۹۔۴۸

۶۔ ایضاً، ص: ۵۰

۷۔ فتح پوری، فرمان: ''اردو ہندی تنازع''، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص: ۱۶۱

۸۔ احمد، میاں بشیر: ''اردو پاکستان کی قومی زبان''، کراچی انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ص: ۴۶

۹۔ احمد، عزیز: محولہ بالا، ص: ۳۸۶

۱۰۔ ایضاً ص: ۳۸۷

۱۱۔ ایضاً ص: ۳۸۷

۱۲۔ فتح پوری، فرمان: ا محولہ بالا، ص: ۱۵۴

۱۳۔ احمد، میاں بشیر: محولہ بالا، ص: ۳۷

۱۴۔ احمد، عزیز: محولہ بالا، ص: ۳۹۴

۱۵۔ احمد، میاں بشیر: محولہ بالا، ص: ۴۷

۱۶۔ فتح پوری، فرمان: محولہ بالا، ص: ۱۶۱

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۶۲۔۱۶۱

۱۸۔ فاروقی، شمس الرحمٰن: محولہ بالا، ص: ۵۱

۱۹۔ ایضاً، ص: ۵۱

۲۰۔ رحمٰن، طارق، ڈاکٹر: محولہ بالا، ص: ۵۹

۲۱۔ احمد، عزیز: محولہ بالا، ص: ۳۴۴

۲۲۔ پریم چند: ''مضامینِ پریم چند'' مرتبہ عتیق احمد، ص: ۱۹۳۔۱۹۲

۲۳۔ فاروقی، شمس الرحمٰن: محولہ بالا، ص: ۵۴۔۵۳